کرشن چندر کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش

ڈاکٹر ارشاد بیگم*

Abstract

Krishan chandar has not written for any fraction of society, sector or some cost but he has written for humanity. He pondered over partition and wrote against human rights abduction. Partition of India was not on the basis of some theory but political issues and motives were also working behind it . Krishan chandar was a sensitive writer. He observed the whole process and concluded that it was result of haterd. He has depicted socio - political issues of his area The way humanity was exploited is depicted in his novels .His novels have become documents for the readers of new generation. Krishan chandar criticises inconsistencies of society and class differences.

کرشن چندر ترقی پسند ناول نگاروں میں منفرد اور اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ وہ ایسے ادیب ہیں جن کی تحریریں کسی خاص مذہب، تہذیب یا قوم کے لیے نہیں ہیں بلکہ انھوں نے تمام معاشرتی جکڑ بندیوں سے بالاتر ہو کر خالصتاً انسانی نقطۂ نظر سے مسائل پر غور و فکر کیا اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف قلم اٹھایا۔ انھوں نے تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں فسادات کا وہ دور دیکھا جب ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم صرف دو قوموں یا نظریات کی تقسیم نہ تھی بلکہ اس کے پس منظر میں سیاست بھی اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ عام آدمی اس تقسیم کے نتائج سے بے خبر تھے اور اس عمل کے سنگین نتائج کا انھیں بالکل اندازہ نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ ان کی جدوجہد سے زمین کے الگ الگ ٹکڑے ان کی ملکیت میں آجائیں گے جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق طرزِ زندگی اختیار کر لیں گے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ ان میں سے کتنے لوگ خوشحالی کے وہ سہانے دن دیکھنے کے لیے زندہ بچیں گے۔

کرشن چندر کا شمار ان حساس ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے ۱۹۴۷ء کی تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے

* شعبۂ اردو، جامعہ فاطمہ جناح برائے خواتین راولپنڈی

زمانے کا بغور جائزہ لیا اور دورانِ تقسیم رونما ہونے والے ان بھیانک واقعات پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب باہمی نفرت کے باعث ہوا۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ناول "غدار" کے اختتامیے میں کیا ہے:

"ہم نے قومی سطح پر نفرت کرنے کا فلسفہ بھی یورپ سے مستعار لیا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ اس فلسفے نے یورپ کی کیا گت بنائی! اچھی شے کہیں سے ملے مستعار لے لو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن نفرت سے اس قدر اندھے نہ ہو جاؤ کہ برے بھلے خواب کا فرق بھول جاؤ۔ میں تو صرف اتنا ہی کہتا ہوں کچھ مٹی کی عزت کرو"۔۔۔(۱)

کرشن چندر نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اس دور کے لوگ نفرت پیدا کرنے والے اسباب کو مدِ نظر رکھیں اور سوچیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی نفرت کوئی وقتی نفرت نہیں ہے بلکہ اس نفرت کے پس منظر میں کئی محرکات ایسے ہیں جو اس نفرت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ دونوں قومیں سنجیدگی سے نفرت پیدا کرنے والے اسباب کے بارے میں سوچیں اور اپنی کدورتیں دور کریں۔ انھوں نے تمام انسانوں کو (چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلم) مخاطب ہوتے ہوئے کہا ہے:

"میری مصیبت یہ ہے کہ میں آج بابر کو بلا کر اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے ہندوستان پر حملہ کیوں کیا؟ یہ بہت بری بات ہے میاں! اپنے گھر لوٹ جاؤ! میں آج شیواجی سے نہیں کہہ سکتا کہ تم اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کا علم کیوں بلند کرتے ہو؟ میں ہندو سے اس کا وید اور مسلمان سے اس کا قرآن نہیں چھین سکتا۔ میں مسلمان کو گوشت کھانے سے منع نہیں کر سکتا۔ ہندو کو دھوتی پہننے سے نہیں روک سکتا۔ میں کسی سے اس کا مذہب، اس کا کلچر، اس کی تاریخ، اس کا مخصوص تمدنی، تہذیبی اوصاف چھیننا نہیں چاہتا۔ میں صرف وہ نفرت چھین لینا چاہتا ہوں۔ وہ جو تمہارے سینے میں دبی پڑی ہے۔ کیونکہ تلوار آج خون آشام ہو چکی ہے کہ وہ انسان کے کسی خواب کو پورا نہ کرے گی۔ اس کے اچھے خواب کو نہ اس کے برے خواب۔۔۔"(۲)

کرشن چندر کے ہاں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی موجود ہے۔ تقسیم سے کس طرح انسانیت کا استحصال ہوا اس کا اندازہ ان کے ناولوں سے بخوبی ہوتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق ان کے کرداروں میں بے نقاب ہیں۔ انسانی فطرت اور جذبات کی بوقلمونی نے ان کی تحریروں کو حسن بخشا۔ ان کا عہد ان کی تحریروں میں سانس لیتا اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں کا حسن ہمیشہ برقرار رہے گا۔ کرشن چندر نے ناانصافیوں اور نفرتوں کے خلاف آواز اٹھانے میں کبھی مصلحت کوشی یا سمجھوتے سے کام نہیں لیا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"اہم بات یہ ہے کہ ایک فنکار کی حیثیت سے کرشن چند کی باغی روح نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کبھی ہار نہ مانی۔ کسی ترغیب لالچ یا خوف کے آگے اپنے قلم کو سرنگوں نہ کیا۔ سامراجی طاقتوں اور سرمایہ پرست سیاسی فلسفوں کے پُر فریب نعروں اور عوام دشمن سازشوں کی حقیقت وہ آخر دم تک اپنے قارئین کو سمجھاتے رہے! اردو نثر میں سماجی اور سیاسی طنز کے شاہکار اگر کہیں ملتے ہیں تو کرشن چندر کی تحریروں میں۔ اس میدان میں کوئی دوسرا ان کا حریف ومقابل نہیں۔"(۳)

کرشن چندر کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو وقت کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے سیاسی اور معاشرتی مسائل کا نہ صرف ادراک رکھتے تھے بلکہ ان کے پس پردہ محرکات پر بھی ان کی نظر تھی۔ انھوں نے پوری بصیرت کے ساتھ ان کی گرہیں کھولیں اور اپنے قارئین کو معاصر صورت حال کا صحیح رخ سمجھنے کی ترغیب دی۔ بقول صالحہ زریں:

"انھوں نے اپنے ناول کے ذریعے ہندوستانی عوام کے ذہنوں کو جھنجھوڑا ہے اور ان میں قوت اور حوصلے کی روح پھونکی ہے۔ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے نئے نئے خیالات بھی متعارف کراتے ہیں۔ کرشن چندر کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش اور جاگیر دارانہ، سرمایہ دارانہ استحصال کے مخالف نفرت وبغاوت ہر ہر قدم پر دیکھی جاسکتی ہے جو ناول نگار کا مطمح نظر معلوم ہوتا ہے۔ آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں اتنی ذہنی بیداری بھی اہم ہے۔"(۴)

کرشن چندر کا پہلا ناول "شکست" ۱۹۴۳ء کو منظرِ عام پر آیا۔ یہ ناول سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" اور عزیز احمد کے ناول "گریز" کے بعد لکھا گیا ہے اسی لیے اس پر ترقی پسند تحریک کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ اس ناول میں کشمیر کی دیہاتی زندگی کو رومانی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ عزیز احمد کے لفظوں میں یہ ناول "مصنف کی شخصیت، اس کی رومانیت، اس کے بنتے ہوئے سیاسی عقیدے، اس کی بے باکی، بے تعصبی اور اس کے ذہنی اور نفسی انقلابات کی ترجمانی کرتا ہے۔"(۵)

"شکست" میں ناول نگار نے برسر اقتدار طبقے کے مظالم کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ غریب ولاچار طبقے کی مجبوری کو بھی پیش کیا ہے۔ کرشن چندر نے نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں کی سفاکی کا پردہ چاک کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح انسانیت کے بنیادی جذبے کا استحصال کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شکست میں کرشن چندر نے معاشرے میں ہونے والی بے اعتدالیوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ ناول بقول ڈاکٹر یوسف سرمست "کشمیر کے حسین پس منظر میں جدید نسل اور جدید خیالات کی پیش کش اور فرسودہ نظام سے اس کی آویزش پر منحصر ہے۔"(۶)

شکست کی کہانی دو نوجوان جوڑوں کی پر خلوص محبت کے گرد گھومتی ہے لیکن اس کہانی کا اختتام ناقابل

فراموش المیے پر ہوتا ہے۔ دونوں جوڑے اپنی محبت کو پانے کے لیے تگ و دو تو کرتے ہیں لیکن آخر میں سماج کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں۔ شکست کے بارے میں علی عباس حسینی رقمطراز ہیں:

> "وہاں کا جاہل، پارینہ رسم و رواج میں جکڑا ہوا، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بکھرا ہوا سماج ان دیہاتوں کے نیم مردہ ابہام صفت باشندوں میں بھی اب اپنی زبوں حالی کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ وہ ان زنجیروں کو جو انھیں صدیوں سے جکڑے ہوئے ہیں، کبھی کبھی کھڑکھڑاتے ہیں، کبھی کبھی جھٹکے دیتے ہیں، لیکن کڑیاں مضبوط ہیں، آہنی حلقے ان کمزور ہاتھوں سے نہیں ٹوٹتے۔ یہی ان کی شکست ہے۔"(۷)

اس ناول کے دو کردار "چندرا" اور "شیام" ایسے ہیں جن میں انقلابی رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرے کی زبوں حالی پر افسردہ بھی ہیں اور معاشرے کی تبدیلی کے متمنی بھی ہیں۔ وہ طبقاتی کشمکش اور سماجی ٹھیکیداروں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں لیکن کبھی قسمت ساتھ نہیں دیتی تو کبھی سماجی جکڑ بندیاں آڑے آجاتی ہیں۔

چندرا ناول کا اہم کردار ہے۔ وہ خود سر ماں کی خود سر بیٹی ہے۔ چندرا کی ماں برہمن زادی تھی، جو خاندانی روایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ایک چمار سے شادی کر کے بغاوت کی مرتکب ہوئی۔ چندرا کو چمار کی اولاد ہونے کی وجہ سے نیچ سمجھا جاتا تھا۔ چندرا کے ہوش سنبھالتے ہی پٹواری نے تین ہزار روپوں کے عوض چندرا سے شادی کی پیش کش کی لیکن اس کی ماں نہ مانی۔ اس جرم کی پاداش میں دونوں ماں بیٹی کو گاؤں سے باہر نکال دیا گیا۔ چونکہ چندرا کو یہ خود سر رویہ ورثے میں ملا تھا اسی لیے اس رویے میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب دیہات کے لوگ اسے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ چندرا بھی اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک راجپوت نوجوان پر دل ہار بیٹھتی ہے۔ موہن سنگھ (راجپوت نوجوان) کی محبت میں سماج سے ٹکراتی ہے۔ وہ موہن سنگھ سے اظہارِ محبت کچھ ان الفاظ میں کرتی ہے:

> "مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ میری ماں خوش ہوتی ہے یا ناراض ہوتی ہے۔ میرے لیے تم ہی سب کچھ ہو۔ لیکن یاد رکھو اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے۔"(۸)

چندرا کی سوچ دوسری لڑکیوں سے مختلف ہے۔ وہ اپنے موجودہ ماحول سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی دیدہ دلیری اس وقت قابل دید تھی جب موہن سنگھ سورنی کے حملے سے زخمی ہو کر ہسپتال پہنچتا ہے۔ چندرا موہن کے بھائی اور ماں کو موہن کے قریب نہیں پھٹکنے دیتی اور ایک بیوی کی طرح اس کی تیمارداری کا کام سنبھالتی ہے۔ جب چندرا کی ماں اسے سمجھاتی ہے کہ اس کا موہن سے کوئی رشتہ نہیں۔ موہن کے گھر والے اپنی اور خاندان کی عزت کو بچانے کے لیے

کوئی قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ چندرا ماں کی بات پر نادم ہونے کی بجائے کڑک کر بولی:

"ہاں بیاہ ہوا ہے۔ اس زمین کے اوپر اس نیلے آسمان کے تلے ہمارا بیاہ ہوا ہے۔ باؤلی کے کنارے ہم نے اپنا پیمان محبت باندھا ہے۔ یہ ہمیشہ بندھا رہے گا۔ موت بھی اس رشتے کو نہیں توڑ سکتی۔ پرماتھا گواہ ہیں۔"(۹)

چندرا زمانے سے ڈرنے والی نہ تھی۔ اسی لیے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ موہن سنگھ کے تندرست ہوتے ہی کسی اور علاقے میں جا بسے گی اور اپنی آنے والی زندگی کو موہن کے ساتھ گزارے گی۔ چندرا میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتی لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا کیونکہ موہن ایک رات ہسپتال سے نکلا اور بسنت کشن جو کہ پنڈت سروپ کشن کا بھائی تھا، موہن نے اسے چھرے کے وار کر کے زخمی کر دیا اور اقدام قتل کی بنیاد پر ہسپتال میں ہی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ پولیس کی بھاری نفری موہن کی نگرانی پر مامور تھی۔ کسی کو موہن سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے کٹھن حالات میں بھی چندرا نے ہمت نہ ہاری اور موہن کے کمرے کی دوسری طرف رہنے لگی۔ ایک دن موہن زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ جب اسے پتا چلا کہ جس موہن کے لیے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اب اس دنیا میں نہیں ہے وہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور بھاگ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کر لی۔ ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی چندرا کے کردار کے متعلق لکھتے ہیں:

"اردو ناول میں سب سے پہلے کرشن چندر نے "شکست" کے ذریعے "چندرا" جیسی باغی عورت کے کردار کو پیش کیا ہے جو کہ سماج اور برادری سے بیزار ہے اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے۔ اس طرح کا کردار اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں ملتا۔"(۱۰)

"شکست" کے ایک اور کردار شیام نے بھی طبقاتی کشمکش اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف کئی بار صدائے احتجاج بلند کی لیکن وہ ہر بار سماج کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ شیام باغیانہ سوچ رکھنے کے باوجود کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا پاتا۔ فرسودہ سماجی روایات اور رسم و رواج سے بغاوت کے بارے میں سوچتے ہوئے شیام کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"۔۔۔انسانی سماج نے پچھلے چند ہزار سالوں میں جو ترقی کی ہے کیا اسی حرکت اور بغاوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ مذہب کے پیغمبر کیا باغی نہ تھے۔ کیا انھوں نے اپنے سماج سے انحراف نہ کیا تھا۔۔۔ اگر زندگی ایک جگہ جم کر بیٹھ رہنے کا نام ہے تو پھر موت کسے کہتے ہیں؟ اگر انسان کے دل میں اس فطری بغاوت کا شعلہ بلند نہ ہوتا تو وہ شاید آج اسی طرح جنگلوں میں دم لٹکائے درختوں پر پھلانگتا پھرتا۔"(۱۱)

شیام تحصیلدار کا بیٹا ہے اور اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ ونتی نچلے طبقے کی پیداوار ہے۔ شیام ذات پات

اور اونچ نیچ کے فرسودہ فرق کو ناپسند کرتا ہے۔ ونتی کا خاندانی پس منظر معاشرے کے لیے قابل قبول نہ تھا کیونکہ اس کی ماں چھایا نے اپنی ازدواجی زندگی کی پرواہ نہ کی اور مسلم گھرانے کے شادی شدہ شخص امجد حسین سے مراسم قائم کر لیے تھے۔ دو دن گھر سے بھاگ کر اس کے پاس بھی رہی برادری کے شور مچانے پر امجد وہاں سے چلا گیا۔ چھایا نے شوہر سے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور اپنا اور بیٹی کا پیٹ پالنے کے لیے دکان چلانے لگی۔ اس دکان کی آمدنی سے امجد کی مدد بھی کرتی رہی۔ چھایا اور اس کی بیٹی ونتی کو برادری والے اچھا نہ سمجھتے تھے۔ شیام ونتی سے نہ صرف محبت کرتا ہے بلکہ شادی کا خواہاں بھی ہے۔ شیام کی اندھی محبت کا علم جب اس کی ماں کو ہوتا ہے تو وہ اس کی منگنی کا انتظام کرنے کا سوچتی ہے لیکن شیام انکار کر دیتا ہے بہر حال ماں رو دھو کر بیٹے کی سوچ میں تبدیلی لے آتی ہے۔ اس طرح وہ عملی طور پر سماج کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر افضال بٹ ''شیام'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شیام اشتراکی خیالات کی وجہ سے طبقاتی کشمکش، خود غرضی، سماجی جبر و استحصال سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے خیالات جتنے باغیانہ اور انقلاب پسندانہ ہیں وہ عملی طور پر اتنا ہی بے بس نظر آتا ہے۔ اس کی سوچ کا دائرہ سماج کو بدلنے کے لیے بڑا متحرک ہے۔" **(۱۲)**

شیام سماج کی بداعتدالیوں سے بیزار تھا اسی لیے اکثر اوقات اس کے باغیانہ جذبات ابھرنے لگتے تھے۔ اس کا ضمیر بار بار ملامت کرتا کہ وہ معاشرے کی فرسودہ روایات کا غلام کیوں ہے؟ ونتی سے قطع تعلقی نے شیام کے دل میں بغاوت کی آگ کو بھڑکا دیا۔ شیام ایک طرف ماں باپ اور سماج کے ہاتھوں مجبور تھا تو دوسری طرف ونتی کو چھوڑنا بھی آسان کام نہ تھا۔ دل و دماغ میں عجیب جنگ چل رہی تھی۔ اس کا ضمیر بار بار جھنجھوڑ رہا تھا۔ مصنف نے اس کی اس حالت کو جب ضمیر ملامت کر رہا تھا ان الفاظ میں بیان کیا:

> "گدھے، اُلو، پاجی، بزدل سن رہے تو تم جی، اب بھی وقت ہے اپنے آپ کو بچا لو۔ ایک بار ہمت سے کام لو میں کہتا ہوں، صرف ایک بار۔ آخر کیا ہو جائے گا۔ تمہارے ماں باپ اس غم سے مر تو نہ جائیں گے۔ کیوں ڈر رہے ہو۔ صرف ایک بار میں کہتا ہوں صرف ایک بار ہمت سے کام لو۔ تمہاری ٹیڑھی میڑھی پژمردہ اداس زندگی اس نغمے کو چھیڑے گی۔ جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے حیران و پریشان ہے۔ ہمت سے کام لو، بزدل نکمے، تخیلی، جنونی، جذباتی، نسائیت پسند۔" **(۱۳)**

شیام کی اس کشمکش کے بارے میں ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

> "شیام سرتاپا شاعرانہ مزاج رکھتا ہے اور اس کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ موجودہ معاشی اور طبقاتی

نظام میں محبت کی ناکامی کا مسئلہ ہے لیکن اس ناول کے بین السطور میں کرشن چندر نے معاشی کشمکش، فرسودہ رسوم وعقائد اور ذات پات کے بندھنوں کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔"(۱۴)

ونتی کو ایک شادی میں دیکھتے ہی شیام اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور ونتی سے میل جول شروع کر دیا۔ جب ونتی کا ماما روشن پنڈت سے دو ہزار روپے لیتا ہے اور ونتی کی شادی پنڈت کے بیٹے سے طے کر دیتا ہے تو شیام نے چھایا کو روشن کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی تجویز دی۔ شیام نے اس سلسلے میں اپنے تحصیلدار باپ سے مدد مانگی اور صاف لفظوں میں بتادیا کہ وہ ونتی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ باپ نے بیٹے کی مدد سے انکار کر دیا۔ چھایا کو کمرے میں بند کر دیا گیا اور ونتی کی شادی کر دی گئی۔ ونتی کی شادی کے بعد شیام نے خاموش احتجاج کیا۔ اس نے سب سے بول چال ختم کر دی گھر والوں نے اس کی منگنی طے کر دی۔ منگنی کی خبر ملتے ہی ونتی جان دے دیتی ہے۔ شیام کو جونہی ونتی کی موت کا پتا چلتا ہے تو وہ ونتی کی لاش کے قریب جا کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے او مائی ڈارلنگ۔۔۔ او مائی ڈارلنگ شیام کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ طبقاتی کشمکش اور سماجی جکڑبندیوں کے خلاف کھلا احتجاج ہیں۔ ایسے کرداروں کے بارے میں مہ نور زمانی رقمطراز ہیں:

"ان کی نیک نیتی اور فطری ذہانت انھیں معاشرے کی فرسودہ روایات اور کھوکھلے اقدار کا صحیح صحیح جائزہ لینے پر آمادہ کرتی ہے، ان کی انقلابی ذہنیت انھیں معاشرے کی ناکارہ رسوم و رواج کے خلاف نبرد آزما ہونے پر اکساتی ہے۔ وہ معاشرے کی تمام تخریبی قوتوں اور انسانیت سوز مظاہروں کے خلاف بھرپور آواز اٹھاتے ہیں، چاہے کامیاب ہوں کہ ناکام، ناکام ہونے پر بھی انھیں اطمینان ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے حقوق کے لیے لڑائی تو کی اور سماج دشمن عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ تو کیا۔"(۱۵)

چندرا اور شیام کے کردار اردو ناول کے ارتقا کے سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر چندرا کا کردار ایسا ہے اس جیسا کردار اس سے پہلے اردو ناول کی روایت میں موجود نہیں۔ اس کی بغاوت نہ صرف اس کی سوچ اور اس کے خیالات سے عیاں ہے بلکہ وہ اسے اپنا رویہ بنا کر اپنے ارادوں پر عمل کرنے کی ہمت و حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ وہ بیک وقت معاشرے اور اس کی روایات اور اپنی تقدیر سے نبرد آزما ہے۔ معاشرے کو تو وہ اپنے آہنی عزائم سے شکست دے دیتی ہے لیکن تقدیر کے ہاتھوں ہر انسان کی طرح مجبور ہے۔ اسی طرح شیام کا کردار بھی بغاوت اور انقلاب کے علمبردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول کے یہ دونوں کردار ترقی پسند دور کے ان رویوں کے بالعموم اور کرشن چندر کے نقطۂ نظر کے بالخصوص آئینہ دار ہیں اور اردو ناول کے انقلابی کرداروں میں انھیں نمایاں مقام حاصل ہے۔

کرشن چندر کے ناول "جب کھیت جاگے" کا مرکزی کردار راگھو راؤ تلنگانہ تحریک کا نمائندہ ہے۔ انقلابی

ذہنیت کے جرم میں اسے نہ صرف بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ زندہ رہنے کا حق مانگنے کی پاداش میں اسے پھانسی کی سزادی جاتی ہے۔ جیل میں زندگی کی آخری رات وہ اپنی کتاب حیات سے ماضی کے اوراق پلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ کس طرح ایک استحصال زدہ طبقے میں اس کا جنم ہوا تھااور اس پر وٹی کا لیبل لگا دیا گیا تھا۔ راگھو کو اچانک وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جب گیارہ بارہ برس کی عمر میں وہ اپنے باپ ویریا کے ساتھ میلہ دیکھنے جاتا ہے اور میلے سے واپسی پر پٹیل کے کارندے بھیمیااور در گیا، راگھو کے باپ کو زمیندار کے پاس جانے کو کہتے ہیں۔ راگھو کا معصوم ذہن بن سوچے سمجھے یہ سوال کرڈالتا ہے کہ آج تو میلہ ہے آج کیوں جائیں۔ سوال پوچھتے ہی بھیمیا اسے اتنا مارتا ہے کہ اس کے ہونٹوں سے خون نکل آتا ہے اور اس کے نئے کپڑے بھی پھاڑ دیتا ہے۔ کیونکہ وٹی کو کوئی حق نہیں کہ وہ نئے کپڑے پہنے۔ اس المناک واقعے کے بعد راگھو کے دل میں زمینداروں سے نفرت پیدا ہو گئی اور اس نفرت میں شدت سے اضافہ اس وقت ہوا جب اس کا باپ اسے بتاتا ہے:

> "وہ سامنے زمینداروں کی عالی شان بنکو دیکھتے ہوئے، میرے بیٹے راگھو۔ اس بنکو نے ہمارا سب کچھ چرا لیا ہے۔ ہمیں آدمی سے جانور بنا دیا ہے۔ میرے بیٹے یہ اونچی بنکو، ہمارے خاندان کی دشمن ہے۔ میرے بیٹے! میرے باپ نے مجھے یہ نفرت سونپی تھی۔ آج تو بڑا ہو گیا ہے۔ آج میں یہ نفرت تجھے سونپتا ہوں۔۔۔ میرے پاس طاقت نہیں ہے۔ طاقت کا راستہ بھی نہیں ہے۔ طاقت کا راستہ بھی نہیں ہے۔ صرف یہ نفرت ہے جسے میں تیرے حوالے کرتا ہوں۔ اگر تو کوئی راستہ ڈھونڈ سکتا ہے تو ڈھونڈ لے۔"(۱۶)

راگھو کے دل پر باپ کی باتوں کا بہت اثر ہوااور وہ سوچنے لگا کہ یہ عالیشان محل اور زمیندار نہ صرف اس کے خاندان کے دشمن ہیں بلکہ اس جیسے کئی کسان بھی ان کی ہوس کا نشانہ بنے۔ بے چارے زمین کے مالکوں سے نہ صرف ان کی زمین چھین کر وٹی (مزارعہ) بنا دیا گیا بلکہ ان کی زندگیوں سے مسرت وانبساط کے حسین لمحوں کو ہی نکال دے اور صلے میں رنج والم کے پہاڑ تلے دبا دیا گیا۔ چند لمحوں کے بعد راگھو کو اپنا دوست ناگیشور یاد آیا جس سے اس کی محبت کی بنیاد بھی اسی مشترکہ نفرت پر مبنی تھی کیونکہ زمیندار ناگیشور سے بلا قیمت مویشی طلب کرلیتا وہ سال میں ایک مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوتا۔ اس طرح راگھواور ناگیشور دونوں کی نفرت بھی ایک ہی سمت کو جاتی تھی۔

راگھو کی لاچار زندگی میں کئی المناک واقعات رونما ہوتے گئے جنھوں نے راگھو کی نفرت کے بوئے ہوئے بیج کو تناور درخت بنا دیا تھا مثلاً گومباڑو خاندان (خانہ بدوش) کی لڑکی چندرا سے محبت نے راگھو کے ذہنی کرب میں اضافہ کیا کیونکہ وہ اسے بتاتی ہے کہ زمیندار نہ صرف اسے (چندرا) بلکہ گاؤں کی باقی نوجوان لڑکیوں کو بھی اپنی جنسی تسکین کے

لیے اپنے پاس بلاتا ہے۔ راگھو پر زمیندار کے مکروہ خیالات کھل جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ کس طرح بے دردی سے یہ زمیندار نہ صرف ہماری زمین و جائیداد کے لٹیرے بنتے ہیں بلکہ ہم غریبوں کی عزت کی دھجیاں اڑانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اس طرح راگھو زمینداروں کو مزید قابل نفرت گردانتا ہے۔ سوچ کے دھارے راگھو کو سوریہ پیٹ کے بنیے کی یاد کی طرف بہا کر لے جاتے ہیں جس کے ہاں وہ برتن مانجھنے کی ملازمت اختیار کرتا ہے۔ بنیے کی بیوی اسے اتنی ہی روٹی دیتی ہے جس پر وہ صرف زندہ رہ سکے۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان بات چیت کا پسندیدہ موضوع زمین و جائیداد کی خرید و فروخت ہے۔ انھیں کسی غریب انسان کی بھوک کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے اس بے حسی والے طرزِ عمل سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بھوکا تو وہ گاؤں میں بھی رہتا تھا اور شہر میں بھی بھوکا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وٹی صرف گاؤں میں ہی نہیں بلکہ شہروں میں بھی رہتے ہیں۔ بنیے کی بیوی اس پر چھوٹی تھالی کی چوری کا الزام لگاتی ہے۔

دلبرداشتہ ہو کر راگھو نوکری سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور حیدر آباد میں آ کر رکشہ چلانے لگتا ہے جہاں اس کی ملاقات ایک پڑھے لکھے مقبول نامی شخص سے ہوتی ہے یہ ملاقات اس کی سوچ میں تغیر و تبدل کا باعث بنتی ہے۔ مقبول راگھو کو پڑھنا لکھنا سکھا کر کسی کاغذ کی مل میں ملازم کروا دیتا ہے۔ مل میں ملازمت کے بعد نہ صرف اسے شہر کے بڑے بڑے سرمایہ داروں بلکہ گاؤں کے زمینداروں کی سازش کا بھی علم ہوتا ہے اور وہ سازش ہے مزدور طبقے کا استحصال۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ سازش زندگی کے تمام شعبوں میں رچ بس چکی ہے۔ وہ اس سازش کی بیخ کنی چاہتا ہے۔ اس طرح مل کی نوکری نے اس کے فکر و شعور کو بدل کر رکھ دیا:

> "مل کی ایک سال کی نوکری میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا، جو وہ شاید دس سال کی کشمکش میں بھی دوسری جگہ اس قاطع صفائی سے نہ سیکھ سکتا تھا۔ اس نے خود اعتمادی سے لڑنا۔ شکست سے نہ گھبرانا، اور اسٹرائیک سے لڑائی کو آگے لے جانا سیکھ لیا۔۔۔"(۱۷)

مل میں کام کرتے راگھو میں نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا بلکہ وہ عملی طور پر بھی مل مالکوں کے غنڈوں سے نبرد آزما ہوا۔ مقبول کی رہنمائی سے ہی اسے ٹریڈ یونین سے آگاہی ہوئی۔ مل میں ہڑتال کے جرم میں اسے چھ ماہ کی سزا ہو جاتی ہے۔ جیل میں راگھو کی ملاقات پرانے دوست ناگیشور سے ہوتی ہے۔ وہ راگھو کو گاؤں شری رام کے مکینوں کی تبدیلیٔ فکر سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ نہ صرف وٹیوں نے بلکہ استحصال زدہ کھیت مزدوروں اور گوالوں نے اپنی ایک الگ جماعت بنالی ہے اور چالیس گاؤں کی ملکیت رکھنے والے جگن ناتھ ریڈی سے اپنی زمینوں کا مطالبہ کیا ہے۔ راگھو پسے ہوئے طبقے کے اس جرات مندانہ اقدام پر خوش بھی ہوتا ہے اور حیران بھی۔ اسی وقت اسے

نے تہیہ کر لیا کہ وہ رہائی کے فوراً بعد گاؤں جائے گا اور اس مطالبے میں وہ بھی گاؤں والوں کا ساتھی ہو گا۔ اسی دوران جگن ناتھ ریڈی ٹریڈی نظام شاہی پولیس اور رضاکاروں کی مدد سے آواز اٹھانے والے کسانوں کا سر کچلنے کا درپے تھا۔ رہائی ملتے ہی راگھو مقبول کے مشورے سے گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اسے راستے میں کئی لاشیں بے گور و کفن پڑی نظر آتی ہیں حتیٰ کہ ایک عورت کی لاش کو گیدڑ کھا رہے ہوتے ہیں۔ کسانوں کی تحریک نے زمینداروں کو بھگا دیا اور تمام زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ جب راگھو گاؤں پہنچتا ہے تو گاؤں والے زمین کی تقسیم کا کام راگھو کے سپرد کرتے ہیں۔ راگھو نے تمام لوگوں میں زمین تقسیم کی لیکن اپنے باپ ویریا کو خلافِ منشا سب سے آخر میں زمین دی:

"سب سے آخر میں جب ویریا قریب قریب مایوس ہو چکا تھا کہ شاید اس کے حصے میں کوئی زمین آئے گی بھی کہ نہیں، اس وقت ویریا کو زمین ملی۔"(۱۸)

زمین کی تقسیم میں چار پانچ دن لگ گئے اور زمین کا مسئلہ حل ہوتے ہی کئی کسان اور ان کی بیویاں بچے بنگلو دیکھنے چلے گئے۔ وہاں ماربل کے فرش اور نفیس دروازوں نے انھیں باغ باغ کر دیا۔ بنگلو کے حصوں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ عورتوں نے کیا۔ راگھو نے زمینداروں کی عشرت گاہ کے بارے میں رائے دی کہ یہاں سکول کھولا جائے۔ یہ زمینداروں کی اس سوچ کے خلاف بہت بڑی برگشتگی (بغاوت) تھی کہ پڑھنے لکھنے سے بغاوت پھیلتی ہے اسی لیے زمیندار جاتے وقت ماسٹر کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ راگھو نے فیصلہ کیا کہ وہ حیدر آباد سے کسی پڑھے لکھے آدمی کو درس و تدریس کے لیے بلائے گا۔ جب تک اس کا انتظام نہیں ہوتا وہ خود پڑھائے گا۔

۱۹۴۷ء میں ۱۵ اگست کا دن کانگریس کی حکمرانی کا دن تھا۔ حیدر آباد پر قبضہ کرنے کے بعد کانگریس نے ہوائی جہازوں کے ذریعے ایسے کاغذ پھینکے جن پر تحریر تھا کہ جن کسانوں نے زمینداروں کی زمینیں چھینی ہیں انھیں واپس کر دیں کیونکہ وہ آپ ہی کے بھائی ہیں۔ راگھو نے گاؤں کے لوگوں کو کانگریس کے اس حکم نامے کے بارے میں مطلع کیا تو کوئی کسان بھی ایسا کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایک دن راگھو سکول میں پڑھا رہا تھا کہ جگن ناتھ ریڈی اور پرتاب ریڈی نے پولیس اور فوج کی مدد سے سری رام پر قبضہ کر لیا اور راگھو کو رضاکاروں کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا اور پھانسی کی سزا سنا دی۔ راگھو نے اپنے اوپر عائد کیے جانے والے جرم کے بارے میں سوچا:

"اگر جرم سے مدافعت کرنا تشدد ہے، اگر اپنی جان کی حفاظت کرنا، اپنی ماؤں عزت بچانا، اپنے گاؤں کے کھیتوں کی سنہری بالیوں کی حفاظت کرنا تشدد ہے تو پھر خود جینا بھی تشدد ہے اور سانس لینا بھی تشدد ہے اور دل کا دھڑکنا بھی تشدد ہے۔"(۱۹)

راگھو کال کوٹھڑی میں پڑے پڑے اپنی زندگی کے بیتے ہوئے تمام لمحوں پر گہری نظر ڈال چکا تھا۔ اسے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا دکھائی نہ دیا جو اس کے لیے باعث شرمندگی ہو۔ اسے صرف یہ خیال تنگ کر رہا تھا کہ اس نے تو کسی کا قتل نہیں کیا اس نے تو صرف اپنے گاؤں کے لوگوں پر ہونے والے ظلم و جبر کو دیکھنے کا جرم کیا ہے۔ اپنے گاؤں کی حفاظت کرنا کوئی ناقابل تلافی جرم تو نہ تھا لیکن پھر سزا؟ بہر حال اس کی یہ کتابِ حیات مکمل ہو چکی تھی وہ تمام اوراق پڑھ چکا تھا۔

اس سوچ کے بعد راگھو اطمینان قلب محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ کال کوٹھڑی میں باپ اسے بتاتا ہے کہ گاؤں کے تمام نوجوان گرفتار ہو چکے ہیں اور زمیندار خوف کے مارے بنگو سے باہر نہیں نکلتا۔ فوج اور پولیس کا پہرا رہتا ہے۔ ویریا(باپ) اسے یہ بھی بتاتا ہے کہ جگن ناتھ نے رنگڈو دھوبی سے کہا ہے کہ اگر راگھو معافی مانگ لیتا تو اسے سزا نہ ہوتی اس پر راگھو کہتا ہے کہ میں کس بات کی معافی مانگوں جب باپ نے اسے ملتجی نگاہوں سے دیکھا تو کہنے لگا جو نفرت تو نے مجھے سونپی تھی اسے کیسے ختم کردوں؟ وہ دوبارہ ماضی کی تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے اور باپ کو میلے والے واقعے کی یاد دلاتا ہے۔ جب نئے کپڑے پہننے اور ریشم کے تھان کو ہاتھ لگانے پر وہ تشدد کا نشانہ بنا تھا۔ آخری رات باپ نے بیٹے کی خواہش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریشم کی قمیض بنوائی اور بیٹے کو پہنائی۔ راگھو سوچنے لگا:

جیسے وہ صرف ایک قمیص نہیں پہنے ہوئے ہے۔ اپنے عوام کا جھنڈا اور ان کی جدوجہد کا عظیم نشان پہنے ہوئے ہے۔ اپنے کھیت پہنے ہوئے ہے۔۔۔**(۲۰)**

سورج طلوع ہوتے ہی راگھو کی موت کی گھڑیاں قریب آتی گئیں۔ وارڈر راگھو کو پھانسی کے تختے کی طرف لے گئے۔ دوسری طرف گاؤں کے لوگ جلوس کی صورت میں گیت گا رہے تھے۔ راگھو کا باپ پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ میرا بیٹا ہمیشہ زندہ رہے گا۔ راگھو کے بارے میں علی سردار جعفری قلم بند کرتے ہیں:

"وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی کے لمحات کو سکوں کی طرح اٹھا اٹھا کے دیکھتا ہے اور کھوٹے کھرے کو الگ کرتا جاتا ہے وہ رات بھر ان سکوں کو گنتا رہتا ہے اور صبح جب سورج طلوع ہو رہا ہے پھانسی چڑھ جاتا ہے۔"**(۲۱)**

راگھو کو موت سے کسانوں کی تحریک بظاہر تو کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کی جان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی کیونکہ اس کے توسط سے نمو پذیر ہونے والے باغیانہ جذبات کسانوں میں بتدریج بڑھتے گئے اور بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس راگھو نے جان کی قربانی دے کر بہت بڑے انقلاب کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں:

"راگھو راؤ کی پھانسی ہندوستان کے اس نئے کسان کو پھانسی دینے کی کوشش ہے جو آج نئی امنگوں کے ساتھ آندھرا تلنگانہ بلکہ پورے ہندوستان میں بیدار ہو رہا تھا۔"**(۲۲)**

اس کردار کے بغور مطالعے سے ایک اور تجزیہ بھی سامنے آتا ہے کہ اس ناول تک آتے آتے اردو ناول میں طبقاتی کشمکش کی پیشکش اپنے ارتقاء کے اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں پر مصنف کرداروں کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھالتے۔ راگھو کا کردار ہوری اور گوبر کی ترقی یافتہ شکل ہے فرق اتنا ہے کہ راگھو کا کردار آخر میں اپنا تجزیہ خود کرتا

ہے اور اپنے کسی فعل پر شرمندہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرتا بلکہ بخوشی اپنی موت کے فیصلے کا خیر مقدم کرتا ہے۔ یوں اس کردار کی طاقت اپنے پیش رو انقلابی کرداروں سے زیادہ نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل مجموعی طور پر اس ناول کے کرداروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب کھیت جاگے" کا کسان ایک طبقاتی جنگ لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ طبقاتی جنگ مارکسی فلسفے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے جو تقریباً ہر دور میں لڑی گئی ہے اور لڑی جائے گی۔ جب تک طبقاتی سوسائٹی کا وجود باقی ہے، انسانی حیات کی تاریخ بجز طبقاتی جنگ کے اور کچھ نہیں ہے۔۔۔ مارکس کے نظریات کے مطابق یہ لڑائی اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ پورے سماج کی دوبارہ تنظیم نہ ہو۔ یا ایک دوسرے کے حریف طبقات ہمیشہ کے لیے ختم نہ کر دیے جائیں۔ کرشن چندر کے کسان میں چنگاریاں ہیں۔ وہ اپنے مخالف طبقے سے لڑ کر ہمیشہ کے لیے ان کا خاتمہ کر دینے کے لیے تیار ہے۔ چاہے اس کوشش میں اسے دار و رسن کی منزل سے بھی کیوں نہ گزرنا پڑے۔ وہ انقلاب کا ایک منظم تصور رکھتا ہے جس کا انحصار کسانوں کی زبردست تنظیم پر ہے۔ کرشن چندر کے کسان منظم ہیں، ان میں تنظیمی صلاحیت ہے۔ یہ وقت پڑنے پر دہشت پسند بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ اس طرح کسانوں کی یہ تحریک ایک مکمل انقلابی تحریک ہو جاتی ہے۔" **(۲۳)**

کرشن چندر کے ناول "غدار" کا مرکزی کردار بیج ناتھ ایسا باغی کردار ہے جو نہ صرف شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے بلکہ ہندو ہونے کے باوجود شاداں نامی مسلمان لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اس سے سرکنڈوں کے جنگل میں چھپ چھپ کر ملتا ہے۔ اس علاقے کا پیر شاہ قلندر یہ حکم نامہ جاری کرتا ہے کہ ۱۵ اگست تک گاؤں میں جتنے بھی ہندو نوجوان ہوں گے انھیں قتل کر دیا جائے گا اور عورتوں کو رکھ لیا جائے گا۔ ۱۵ اگست کی شام گاؤں چک تارہ سے ۵۰۰ مسلمان حملہ آور ہوتے ہیں۔ شاداں ایسے کٹھن حالات میں بیج ناتھ کو گاؤں چھوڑ کو لاہور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ اور ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کا بھائی طفیل اُسے اسٹیشن تک پہنچا دے گا۔ لیکن بیج ناتھ ایسا کرنے سے انکاری ہوتا ہے وہ مذہبی و معاشرتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا دونوں میں بحث و تکرار ہوتی ہے:

"وہ بولی: "اٹھو، یاد کرو، تمہارے بیوی اور بچے ہیں"۔ ماں اور باپ ہیں، بہنیں اور بھائی ہیں ان سب کی حفاظت تمہارے ذمے ہے!" "جہنم میں جائیں سب لوگ!" میں نے روتے ہوئے کہا، "میں یہیں رہوں گا۔ میں مسلمان ہو جاؤں گا اور تم سے شادی کر لوں گا۔" **(۲۴)**

بہر حال شاداں کے سمجھانے پر وہ گاؤں چھوڑ دیتا ہے اور چھپتا چھپاتا لاہور پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اپنے گھر کا تالا توڑتا ہے۔ تو سارا قیمتی سامان غائب پا کر پریشان ہو جاتا ہے اور اپنے دوست میاں کے گھر آ جاتا ہے۔ لیکن وہاں بھی دونوں کا دوست حاجی غنڈوں کو بیج ناتھ کی گرفتاری کے لیے بھیج دیتا ہے۔ میاں صاحب مجبوراً اسے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیتے ہیں۔ باہر ہر طرف فتنہ وفساد کی فضا ہوتی ہے۔ وہ ریل گاڑی میں سوار ہونے کی بجائے اسٹیشن پر ہی رہتا ہے اور اسے اپنا پرانا دوست شاہد مل جاتا ہے جو لاہور اسٹیشن پر ٹی۔ٹی تھا۔ وہ بیج ناتھ کو اس کے آبائی گاؤں یعنی شکر گڑھ کے گاؤں سودکاں کا ٹکٹ لا دیتا ہے۔ اور وہ اپنے زمیندار دادا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات تمام گھر والوں سے ہو جاتی ہے۔ آٹھ دس روز خیر وعافیت سے گزرنے کے بعد ایک دن ان کے گھر پر حملہ ہو جاتا ہے اور وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر کمادوں (گنے) کے کھیت میں چلا جاتا ہے اور کافی دور نکل جاتا ہے۔ لیکن بھوک پیاس کی شدت اسے دوبارہ گھر واپس لے آتی ہے۔ جب گھر آتا ہے تو سارے گھر والوں کی لاشیں دیکھتا ہے۔ دادا کی لاش باہر گھر کی دہلیز پر پڑی ہوتی ہے۔ وہ خوف وہراس کے ان مناظر میں روٹی پانی لیتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ کتیا رومی بھی اس کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ راستے میں وہ کئی قافلوں کو لٹتے ہوئے بھی دیکھتا ہے۔ ہندو مسلمان قافلوں کو ختم کر دیتے تو مسلمان بھی ہندوؤں کے قافلوں پر دھاوا بول دیتے۔ لیکن وہ کہیں بھی ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتا۔ بیج ناتھ نے مذہبی جنونیت پر کڑی تنقید ان الفاظ میں کی:

"تو کتیا ہے، تجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔ تو انسان تھوڑی ہے کہ تجھے اپنی جان کا ڈر ہو۔
یہ تو سب تہذیب کی باتیں ہیں۔ اونچے مذہب اور اخلاق کے جھگڑے ہیں۔ یہ تلوار
تو بہت بلند اصولوں کی حمایت میں نکلی ہے۔ شکر کر کہ تیرا گلا اس سے چھوٹا۔" **(۲۵)**

کرشن چندر اردو کے ان چند بڑے ناموں میں سے ایک ہیں جنھوں نے وہ دور دیکھا ہے جب ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے اور اس کے علاوہ ذات پات اور طبقاتی کشمکش نے عام انسان کا جینا اجیرن کر رکھا تھا۔ اس کشمکش کو کرشن چندر نے اپنے ناولوں کا نہ صرف موضوع بنایا بلکہ ان کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ ان کے ناول آنے والے قارئین کے لیے اس عہد کی ایک دستاویز بن کے رہ گئے ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماج کی ہر اس برائی کا بیان موجود ہے جس نے عام انسان کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ آج کے دور میں بھی کرشن چندر کے ناول ایسی عکاسی کرتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد اور اس عہد میں سماج اور بطور خاص زمیندار اور کسان کی زندگیوں اور عمل میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کرشن چندر، "غدار"، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۵، ۱۵۴

۲۔ ایضاً، ص، ۱۵۵

۳۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، "کرشن چندر"، ایک جائزہ مشمولہ کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ، مرتبہ: مشرف احمد، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۳

۴۔ صالحہ زریں، "اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ"، ص ۲۱۹

۵۔ عزیز احمد، "ترقی پسند ادب، کاروانِ ادب"، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۷

۶۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، "بیسویں صدی میں اردو ناول"، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۶۷

۷۔ علی عباس حسینی، "ناول کی تاریخ و تنقید"، لاہور اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۴۸۳

۸۔ کرشن چندر، "شکست"، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، طبع اول دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۰

۹۔ ایضاً، ص ۸۶

۱۰۔ عبدالسلام صدیقی، ڈاکٹر، "کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ"، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۵۰

۱۱۔ کرشن چندر، شکست، ص ۷

۱۲۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، "اردو ناول میں سماجی شعور"، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۱

۱۳۔ کرشن چندر، شکست، ص ۱۴۳

۱۴۔ خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر، "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۹۰

۱۵۔ مہ نور زمانی بیگم، "کرشن چندر کے ناولوں کے نسوانی کردار"، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۸۶

۱۶۔ کرشن چندر، "جب کھیت جاگے"، سلیم برادرز، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۴۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۴، ۱۳۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۲۱۔ علی سردار جعفری، "دیباچہ"، "جب کھیت جاگے"، از کرشن چندر، سلیم برادرز، لاہور، ۱۹۵۲، ص ۱۵

۲۲۔ سید محمد عقیل رضوی، ڈاکٹر، "ماہنامہ"، شاعر، ممبئ، کرشن چندر، نمبر، ۱۹۶۷، ص ۳۲۸

۲۳۔ سید محمد عقیل، ڈاکٹر، "جب کھیت جاگے" مشمولہ کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ، مرتبہ: مشرف احمد، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۳۵۰،۳۴۹

۲۴۔ کرشن چندر، "غدار"، ص ۲۲، ۲۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۷،۵۶